حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم

بلقان ریاستوں کا سفر

الحمد لله رب العالمين والصلوة والسلام على رسوله الكريم وعلى آله وأصحابه أجمعين وعلى كل من تبعهم باحسان إلى نے يوم الدين أما بعد

آج سے بارہ سال پہلے میں نے مشرقی یورپ کے ملک البانیہ کا سفر کیا تھا، اور دینی لحاظ سے اس کی حالت زار کا مفصل تذکرہ اپنے سفرنامے میں کیا تھا جو میری کتاب "سفر در سفر" میں چھپ چکا ہے۔ یہ سفر میں نے برطانیہ کی تنظیم "مسلم ویلفئر انسٹی ٹیوٹ" کی دعوت پر کیا تھا۔ اس رمضان ۱۴۳۹ھ میں مجھے اسی تنظیم کے سربراہ مولانا حنیف صاحب نے بتایا کہ وہ برطانیہ کے متعدد علماء کے ساتھ بلقان ریاستوں کا دورہ کررہے ہیں، جن میں البانیہ کے علاوہ مقدونیہ، مونٹی نیگرو اور بوسنیا بھی شامل ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ پچھلے بارہ سال کے دوران ان ملکوں میں دعوتی اور تبلیغی کام خاصا آگے بڑھا ہے، اور اب ضرورت ہے کہ اس کو مزید آگے بڑھانے کے لئے علماء کا ایک دورہ ہو جس سے کام کرنے والوں کی ہمت افزائی بھی ہوگی، اور مزید کام کے لئے بنیادیں بھی ڈالی جاسکیں گی۔ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ڈابھیل کے مفتیٔ اعظم حضرت مولانا احمد خانپوری صاحب مدظلہم نے بھی اس سفر میں ساتھ رہنے کا وعدہ فرمالیا ہے۔ ان کی خواہش تھی کہ عید کے فوراً بعد میں بھی ان کے قافلے میں شامل ہوجاؤں، تو ان شاء اللہ دورے کے مفید اثرات میں اضافہ ہوگا۔ اگرچہ عمر کے اس حصے میں اس قسم کے طوفانی دورے میرے لئے مشکل ہوتے ہیں، لیکن البانیہ کے پچھلے سفر میں میں نے جو حالات دیکھے تھے، ان کی وجہ سے میں نے اللہ تعالیٰ کے نام پر یہ دعوت قبول کرلی، اور ۴ر شوال ۱۴۳۹ھ کا دن گذار کر رات کے ساڑھے چار بجے دوحا کے راستے مقدونیہ (Macedonia) کے دارالحکومت اسکوپیا (Scopje) کے لئے روانہ ہوا، اور مقدونیہ کے وقت کے مطابق (جو ہم سے تین گھنٹے آگے ہے) صبح کے سوا گیارہ بجے اسکوپیا کے ہوائی اڈے پر اترا جہاں مولانا حنیف صاحب کے نمائندے مولانا رجب صاحب نے استقبال کیا جو رائے ونڈ کے مدرسے کے پڑھے ہوئے ہیں، اور اردو اچھی طرح بولتے اور سمجھتے ہیں۔ طویل سفر اور رات کی بے خوابی کی بنا پر وہ دن کچھ آرام اور اسکوپیا کے قریبی

تاریخی مقامات دیکھنے میں گذرا۔

یہ سارا علاقہ جزیرہ نمائے بلقان کا ایک حصہ تھا، جزیرہ نمائے بلقان یورپ کا ایک مثلث نما جزیرہ ہے جو شمال میں وسطی یورپ اور جنوب میں بحر ابیض کے مشرقی حصے سے ملتا ہے۔ بلقان کے بیشتر علاقوں کے کنارے ایڈریاٹک یا بحر آئجین یا بحر اسود سے ملتے ہیں۔ کسی زمانے میں بلقان کا بیشتر حصہ خلافت عثمانیہ کا ایک ڈویژن تھا۔ پہلی جنگ عظیم کے بعد بلقان کے جو حصے خلافت کے ماتحت تھے، ان میں سے اکثر رفتہ رفتہ خلافت کے تسلط سے نکلتے گئے۔ البانیہ نے ایک مستقل ریاست کی حیثیت اختیار کرلی، اور کچھ عرصے بعد بلغراد، مقدونیہ، مونٹی نیگرو اور بوسنیا پر آسٹریا کا تسلط رہا، پھر کمیونسٹ انقلاب کے بعد اس کے بیشتر حصے یوگوسلاویہ کا حصہ بن گئے تھے، یوگو سلاویہ کی تحلیل کے بعد ۱۹۹۱ء سے اب یہ ایک مستقل ملک ہے۔ کمیونسٹ حکومت کے دور میں یہاں مسلمانوں پر اتنے مظالم تو نہیں ہوے جتنے البانیہ میں ہوئے، لیکن پھر بھی کمیونسٹ حکومت کے تحت مسلمانوں کو زندگی بسر کرنا مشکل ہوگیا۔ اسکے صرف ایک مشرقی شہر بتولا (Bitula) میں جو درحقیقت بیت اللہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے، بہتر مسجدیں تھیں جن میں مدارس بھی تھے۔ کمیونسٹ انقلاب کے بعد ان کی اکثریت کو شہید کردیا گیا، اور صرف دس مسجدیں باقی رہ گئیں جن میں سے صرف چار استعمال میں ہیں، اور ایک کو عجائب گھر بنادیا گیا ہے۔ اس لئے مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد مختلف ملکوں میں جابسی۔ چنانچہ اب یہاں مسلمانوں کا تناسب تقریباً چالیس فی صد رہ گیا۔ اس کو پیا ایک خوبصورت شہر ہے جو دریائے واردار کے دونوں طرف آباد ہے۔ مولانا رجب نے بتایا کہ اس کے ایک طرف زیادہ تر عیسائیوں کی آبادی ہے، اور دوسری طرف زیادہ تر مسلمانوں کی۔

الحمدللہ یہاں خلافت عثمانیہ کے زمانے کی خوبصورت مسجدیں اب بھی موجود ہیں، اور ہماری قیام گاہ ہوٹل بوشی کے بالکل ساتھ سلطان سلیم کے ایک وزیر مصطفیٰ پاشا کی بنائی ہوئی شاندار مسجد تھی جو ۱۴۹۲ء میں تعمیر ہوئی تھی، یعنی وہ تقریباً پونے چھ سو سال پرانی ہے، لیکن اس کا شکوہ اب بھی برقرار ہے۔ ہم نے ظہر کی نماز اسی مسجد میں پڑھی، لیکن نمازیوں کی ایک صف بھی پوری نہیں تھی۔ کچھ مسجدوں میں بچوں کے لئے مکتب بھی قائم ہیں۔

ہمارا پہلے سے نظم یہ تھا کہ بدھ کی صبح تبلیغی مرکز میں حاضری دیں گے، اور وہاں خطاب بھی ہوگا۔ اب برطانیہ سے حضرت مفتی شبیر صاحب مدظلہم اور ان کے ہونہار صاحبزادے مولانا یوسف صاحب (جو آخر وقت تک میری کار میں میرے بہترین رفیق رہے، اور ان کے علمی ذوق کا مجھے پہلے سے بڑا خوشگوار تجربہ تھا)

اور میرے عزیز دوست مولانا ابراہیم راجہ صاحب بھی بندہ کی رفاقت کے لئے ہمارے ساتھ شامل ہو گئے تھے، اور مسلم ویلفیئر انسٹی ٹیوٹ کے ٹرسٹی اور دار العلوم بلیک برن کے استاذ مولانا رفیق صاحب اپنی اہلیہ اور صاحبزادے حماد سلمہ کے ساتھ اور احمد آباد انڈیا کے افضل میمن صاحب بھی اپنی اہلیہ کے ساتھ لندن سے اوہرد (Ohird) ائیر پورٹ پر اتر کر تقریباً چار گھنٹے کا سفر کر کے میرے پاس اسکوپیا پہنچ گئے تھے، اور قافلے کے منتظم حضرت مفتی احمد خان پوری صاحب مدظلہم اور دوسرے رفقاء کے ساتھ اوہرد شہر میں ٹھہر گئے تھے۔ چنانچہ مولانا رجب صاحب اوہرد سے آنے والوں کے ساتھ تین گاڑیوں میں ہمیں وہاں لے جانے کے لئے اسکوپیا سے روانہ ہوئے۔ میری گاڑی میں مولانا ابراہیم راجہ اگلی سیٹ پر تھے۔ مولانا رجب صاحب پہلے مقدونیہ کے جنوبی شہر تیتووا (Tetovo) لے گئے جسمیں تقریباً نوے فی صد مسلمانوں کی آبادی ہے، اور اس کے بعض مضافاتی دیہات میں سو فی صد مسلمان ہیں۔ یہاں بھی شرینہ مسجد کے نام سے ایک ۱۴۹۵ء میں بنی ہوئی تقریباً پونے چھ سو سال پرانی نہایت خوبصورت مسجد ہے جس کی آب وتاب الحمد للہ ابتک برقرار ہے۔ یہ مسجد دو بہنوں نے تعمیر کروائی تھی، ان دونوں بہنوں کا مزار بھی مسجد کے احاطے میں ہے۔ نیز اس مسجد میں بچوں کی دینی تعلیم کے لئے ایک مکتب بھی سالہا سال سے قائم تھا۔ ترکی کے صدر رجب طیب اردگان صاحب نے یہاں کا دورہ کیا، تو اس مکتب کے لئے ایک اچھی عمارت بھی تعمیر کرادی۔ ہم اس مدرسے میں گئے تو وہاں ایک چھیاسی سالہ بزرگ شیخ محمود سے ملاقات ہوئی جنہوں نے بتایا کہ وہ پچاس سال سے یہاں قرآن کریم اور ابتدائی دینی تعلیم کی خدمت انجام دے رہے ہیں، اور ابتک ایک سو اسی بچوں کو حافظ بنا چکے ہیں۔ کمیونسٹ دور میں یہ کام قدرے چھپ چھپ کر کیا گیا، البتہ آزادی کے بعد اب کوئی روک ٹوک نہیں ہے۔ ان کی تپائی پر ایک کتاب رکھی تھی، دیکھا تو وہ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب "احیاء علوم الدین" تھی۔ ہم نے ان سے مولانا رجب صاحب کی ترجمانی کے ذریعے پوچھا کہ انہوں نے تعلیم کیسے حاصل کی؟ تو انہوں نے یہ مختصر جواب دیا کہ ": کچھ مشائخ سے "۔ بظاہر دوسرے کمیونسٹ علاقوں کی طرح انہوں نے بھی چھپ چھپ کر ہی پڑھا ہوگا۔

اس چھوٹے سے خوبصورت شہر میں جگہ جگہ خواتین باپردہ نظر آئیں، اور شہر پر عمومی طور سے مسلمانوں کا شہر ہونے کا تأثر ملا۔ یہ جمعرات کا دن تھا، اور یہاں بڑے سلیقے کے ساتھ جمعرات بازار لگا ہوا تھا جس کے خاتمے پر تیتووا شہر کے عثمانی حاکم کی رہائش گاہ تھی جو وسیع تو بہت تھی، لیکن عمارتیں سادگی کا نمونہ۔

اسی شہر کے مضافات میں تبلیغی مرکز الحمدللہ تعالیٰ قائم ہو چکا ہے۔شروع میں کچھ اللہ کے بندوں نے ایک گھر میں کام شروع کیا تھا۔اب اس کے لئے ایک خاصی وسیع عمارت تعمیر ہوگئی ہے۔یہاں ہم نے نماز ظہر ادا کی،اس کے بعد بندے نے حاضرین سے خطاب کیا جس میں یہاں کے مسلمانوں کو مبارکباد دیکر یہاں کی دینی ضروریات کی تکمیل کے لئے تبلیغی کام اور تعلیم کی اہمیت پر زور دیا۔بیان کا مقامی زبان میں ترجمہ مولانا رجب صاحب نے کیا۔حضرت مولانا مفتی شبیر صاحب نے بھی خطاب فرمایا۔

ان حضرات نے کھانے کا پُر تکلف انتظام کیا ہوا تھا جس میں خود ذبح کئے ہوئے بکرے کا نہایت لذیذ گوشت بھی شامل تھا،لیکن چونکہ ہمیں یہاں سے البانیہ کے ایک شہر پوگرادیس جانا تھا، جہاں مولانا حنیف صاحب اور ان کے رفقاء اوہر دشہر کا دورہ کر کے پہنچنے والے تھے،اور مغرب کے بعد ایک اجتماع بھی تھا،اور دوپہر کے کھانے کے بعد میرے لئے سفر بہت تعب کا باعث ہوتا ہے،اس لئے میں نے کھانا کھانے کے بجائے یہاں کے نہایت شیریں تربوز اور خربوزے پر اکتفا کیا۔

البانی مسلمانوں کی ایک تنظیم "منتدی الشباب الاسلامی" کا ایک مرکز مقدونیہ میں بھی ہے۔اسکے سربراہ شیخ احمد میمیتی ازہر کے فارغ التحصیل بڑے فاضل اور فعال نوجوان ہیں،اور آجکل سوئٹزرلینڈ میں مقیم ہیں انہوں نے ہی مجھے اس سے پہلے سوئٹزرلینڈ میں اپنی تنظیم کے کنونشن میں مدعو کیا تھا جس کی تفصیل میرے داماد مولانا عبداللہ نجیب سلمہ نے لکھ کر البلاغ میں شائع بھی کی تھی۔اس کے بعد ایک مرتبہ میں ان کی دعوت پر آسٹریا کے دارالحکومت ویانا بھی گیا تھا۔ انہیں جب معلوم ہوا کہ میں مقدونیہ آرہا ہوں،تو انہوں نے کوشش کی کہ وہ اس موقع پر میری رفاقت کے لئے یہیں آجائیں۔لیکن انہیں چھٹی نہ مل سکی،البتہ ان کی خواہش تھی کہ میں ان کے مرکز میں بھی حاضری دیکر نوجوانوں کو کچھ نصیحت کروں۔یہ مرکز مزید جنوب میں کچھ فاصلے پر ایک شہر گوستی وار (Gostivar) میں ہے،جو وادیٔ پولاگ میں واقع ہے،اور اس کی آبادی تقریباً اسّی ہزار ہے۔چنانچہ تبلیغی مرکز سے روانہ ہو کر اس شہر میں پہنچے جہاں بیس بیس کیلو کے تربوز دوکانوں میں رکھے نظر آئے۔اسی شہر کے درمیان ایک خوبصورت قدیم مسجد کے سامنے "منتدی الشباب الاسلامی" کا مرکز ہے جہاں ان کے نوجوان نمائندے شیخ معمر (فاضل ازہر) نے ہمارا استقبال کیا،اور اپنی لائبریری دکھائی،جو عربی اور مقامی زبانوں میں اسلامی علوم پر وقیع کتابوں سے بھری ہوئی تھی۔یہاں ہم نے ایک ایسی کتاب بھی دیکھی جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھی

تھی۔ یہ "لوامع القول شرح راموز الاحادیث " تھی۔ یہ مرکز اسلامی علوم کے طلبہ اور اساتذہ کے لئے ایک مفید دارالمطالعہ کا کام کرتا ہے، نیز اس میں بعض درس بھی ہوتے ہیں۔ شیخ احمد سے جو سوئٹزرلینڈ میں تھے، ساتھیوں نے اسکائپ پر رابطہ کرایا، وہ ہماری آمد پر انتہائی مسرور تھے، اور بار بار شکریہ ادا کر رہے تھے۔

اب تقریباً چار بجے سہ پہر کا وقت ہوگا جب ہم یہاں سے البانیہ کے لئے روانہ ہوئے۔

تقریباً دو گھنٹے کا یہ سفر نہایت خوبصورت سرسبز پہاڑوں اور زرخیز زمینوں پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد ہم مقدونیہ اور البانیہ کی سرحد پر پہنچے جہاں ساتھیوں کی امیگریشن میں بہت دیر لگ گئی۔ مقدونیہ اور البانیہ کو مشرقی یورپ کی مشہور جھیل "اوہرد لیک (Ohrid Lake)" تقسیم کرتی ہے جس کے ایک طرف مقدونیہ کے پہاڑ ہیں، اور دوسری طرف البانیہ کے۔ سرحد سے نکل کر ہم مسلسل اس جھیل کے کنارے سفر کرتے رہے۔ پوگرادیس ابھی کچھ دور تھا، اور خطرہ تھا کہ وہاں پہنچنے تک نماز عصر کا وقت نہ نکل جائے۔ اس لئے راستے کی ایک مسجد میں ہمارا تین گاڑیوں کا قافلہ رُکا۔ قریب میں ایک بستی تھی۔ ہمیں دیکھ کر پورے محلّے کے مرد، عورتیں اور بچے جمع ہوگئے، نہ وہ ہماری زبان سمجھتے تھے، نہ ہم انکی، لیکن انکے چہروں سے مسرت پھوٹی پڑ رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ بڑھکر ہماری کچھ نہ کچھ مدد کرنے کی فکر میں تھے۔ ہمارے قافلے میں تین خواتین بھی تھیں۔ مقامی خواتین انہیں اصرار کر کے اپنے گھروں میں لے گئیں۔ ایک خاتون مسلسل میری اہلیہ کا ہاتھ پکڑے رہیں، اور وضو سے لیکر نماز تک ہر کام بڑی محبت سے کراتی رہیں۔ نماز کے بعد وہ اور دوسری خواتین اپنے بچوں پر مجھ سے دَم کرانے کے لئے لے آئیں، بعض بچوں سے سورۂ فاتحہ سنوائی، اور جو خاتون میری اہلیہ کے ساتھ تھیں، وہ اپنے گھر سے بڑی لذیذ چیریاں ایک تھیلے میں لائیں، اور میری اہلیہ کے ہاتھ میں دیدیں، اور بار بار السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ کہتی رہیں۔ سلام کے علاوہ ہم انکی اور وہ ہماری کوئی بات نہیں سمجھ سکتے تھے، لیکن انکے چہروں سے ایمانی رشتے کی محبت اور اسکی چمک دل ودماغ کو شاداب کر رہی تھی۔

پوگرادیس اوہرد جھیل کے کنارے ایک خوش منظر شہر ہے۔ پروگرام یہ تھا کہ مغرب کے بعد وہاں ایک مسجد میں اجتماع سے خطاب کرنا ہوگا۔ لیکن ہمیں راستہ تلاش کرنے میں دیر ہوگئی۔ یہاں برطانیہ سے مولانا حنیف صاحب، حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب مدظلہم اور اپنے دوسرے رفقاء کے ساتھ پہلے سے پہنچے ہوئے تھے، اس لئے اس اجتماع میں ان حضرات نے شرکت کی، اور ہم جھیل کے کنارے براہ راست ہوٹل ملینیم پہنچ

گئے۔ یہاں اس سفر میں پہلی بار حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب مدظلہم سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا جن سے مل کر مجھے ہمیشہ ایک روحانی سرور محسوس ہوتا ہے، اور انکی شفقت ومحبت کی مٹھاس رگ وپے میں محسوس ہوتی ہے۔

عشاء سے پہلے اسی ہوٹل میں مسلم ویلفیئر انسٹی ٹیوٹ سے تعلق رکھنے والے ملک بھر کے کارکنوں کا اجتماع تھا، اور بہت سے البانی مسلمان نیز میری یہاں آمد کو سُن کر لندن، مانچسٹر، لیسٹر، اسکاٹ لینڈ اور برطانیہ کے مختلف علاقوں سے دسیوں علماء اور دوسرے احباب بھی یہاں پہنچے ہوئے تھے، اور اسی ہوٹل میں کمرے بک کرائے ہوئے تھے۔ ہوٹل کے وسیع ہال میں انکا اجتماع ہوا۔ اس اجتماع سے میں نے خطاب کیا، اور کارکنوں کو مبارکباد دیتے ہوئے عرض کیا کہ بارہ سال بعد اس مرتبہ البانیہ آکر مجھے اس بات کی بڑی خوشی ہوئی کہ اس عرصے میں یہاں کی فضا میں نمایاں تبدیلی محسوس ہورہی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے یہ آپ حضرات کی مخلصانہ جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ پھر مجھے اس علاقے میں جن مزید کاموں کی ضرورت محسوس ہوئی، انکا ذکر کرتے ہوئے اخلاص للہ اور رجوع الی اللہ کرنے اور کرتے رہنے کی تلقین کی۔

مولانا حنیف صاحب نے تنظیم کے کاموں کا مختصر تعارف کرایا، پھر قریبی جھیل کی مچھلی سے سب کی تواضع کی۔ بعد میں جھیل کے کنارے ہوٹل کے صحن میں ہم نے نہایت خوشگوار اور روح پرور ہواؤں کے درمیان نماز عشاء ادا کی جسکا وقت ان دنوں ساڑھے دس بجے ہورہا تھا، اور ہم نے گیارہ بجے نماز پڑھی۔

دن بھر کے اس طویل سفر کے بعد رات ہم نے پوگرادیس میں گذاری۔

اگلے دن جمعہ تھا، اور ہمیں البانیہ کے دارالحکومت ترانا میں دو دن قیام کرنا تھا، اس لئے صبح نو بجے ہم ترانا کے لئے روانہ ہوگئے، اور تقریباً تین گھنٹے کا فاصلہ پہاڑوں اور سبزہ زاروں کے درمیان طے کرتے ہوئے ترانا پہنچے۔ جب میں بارہ سال پہلے ترانا آیا تھا، تو یہاں اکا دکا مسجدیں تھیں، باقی سب کمیونسٹ دور میں یا شہید کردی گئی تھیں، یا انکو کسی اور عمارت میں تبدیل کردیا گیا تھا، لیکن اب بفضلہٖ تعالیٰ بہت سی مسجدیں دوبارہ تعمیر ہوگئی ہیں جنکے منارے دور سے نظر آتے ہیں۔ اُس وقت تبلیغی مرکز بھی ایک جھونپڑی میں تھا، اور اس میں کام کرنے والے بھی اکا دکا تھے۔ لیکن اب ماشاء اللہ شہر کے مضافاتی علاقے میں ایک بڑی جگہ لیکر اس میں مرکز تعمیر کیا گیا ہے۔ ڈیوزبری کے حافظ پٹیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یہاں دعوت کا کام بڑھانے کی بڑی فکر تھی، اور انہی کی کوششوں سے یہ مرکز بنا، اور انہوں نے ہی اسکا سنگ بنیاد رکھا تھا، اور اللہ تعالیٰ انہیں اپنی خاص رحمتوں سے نوازیں کہ الحمدللہ اسکی عمارت

اب اتنی وسیع بن گئی ہے کہ اس میں اچھا اجتماع ہوسکتا ہے۔اور الحمدللہ اس مرکز کے سامنے والی سڑک بھی انہی کے نام سے سرکاری طور پر حافظ پٹیل روڈ کہلاتی ہے۔

یہاں جمعہ سے پہلے میرا بیان ہوا۔بارہ سال پہلے کسی دینی بیان میں اتنے اجتماع کا تصور مشکل تھا۔لیکن آج بفضلہ تعالیٰ ہال حاضرین سے بھرا ہوا تھا جس میں عام البانوی مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ میں نے اپنے بیان میں البانی حضرات سے کہا کہ انہوں نے اسلام کی خاطر جو قربانیاں دی ہیں، انکی وجہ سے انہیں ایمان کی وہ حلاوت نصیب ہے جو ہم جیسوں کے لئے قابل رشک ہے جنہیں ایمان بیٹھے بٹھائے مل گیا۔پھر میں نے عام مسلمانوں کو تبلیغی جماعت سے وابستہ رہنے اور اپنے بچوں کی دینی تعلیم پر توجہ دینے پر زور دیا، بیان کا ساتھ ساتھ البانوی زبان میں ترجمہ مولانا رجب صاحب نے کیا جو اسکوپیا سے آخر تک سفر میں ہمارے ساتھ رہے۔حضرت مفتی احمد خانپوری صاحب اور مفتی شبیر صاحب مدظلہما نے الگ الگ دو دوسری مسجدوں میں بیان فرمایا۔

اسی دن شام چار بجے سے تبلیغی مرکز میں ایک اور بڑا اجتماع تھا جس سے مذکورہ دو بزرگوں نے خطاب فرمایا، اور مغرب سے عشاء تک خطاب میرا رکھا گیا تھا، چنانچہ میں نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بیان کیا جس میں دعوت دین کے بنیادی اصول تفصیل کے ساتھ ذکر کئے، اور اس بات پر زور دیا کہ اس ملک میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں یا تنظیمیں قائم ہیں، انکے درمیان باہمی تعاون اور ربط کی ضرورت ہے جس میں فروعی یا تنظیمی اختلافات رکاوٹ نہیں بننے چاہییں۔جو شخص بھی کسی دوسرے شخص کو جس طرح بھی دین سے قریب لا رہا ہے، ہر ایک کو یہ سمجھنا چاہئے کہ وہ اسکا اپنا کام کر رہا ہے، اور اسکی قدر پہچاننی چاہئے۔الحمدللہ اس کا اچھا اثر محسوس ہوا۔

اسی شام مسلم ویلفیئر انسٹی ٹیوٹ کے تحت خواتین کا ایک اجتماع رکھا گیا تھا جس میں بہت سی معلمات بھی موجود تھیں، اور شہر کی دوسری خواتین بھی۔اس اجتماع کے بارے میں مولانا حنیف صاحب نے مجھے پہلے سے بتایا ہوا تھا کہ اس سے میری اہلیہ کو خطاب کرنا ہے۔چنانچہ وہاں میری اہلیہ نے خطاب کیا جسکا البانی ترجمہ ایک مقامی خاتون نے البانی زبان میں کیا۔بعد میں معلوم ہوا کہ الحمدللہ اس خطاب کا بھی خواتین نے بہت اچھا اثر لیا، اور بعد میں میری اہلیہ سے رابطہ بھی کرتی رہیں۔

اگلے دن مسلم ویلفیئر انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے ترانا کے مرکزی علاقے میں ترانا انٹرنیشنل ہوٹل میں ایک کانفرنس کا اہتمام کیا تھا جس میں البانیا کے مشیخۃ اسلامیہ کے رئیس اور مختلف شہروں کے مفتی حضرات اور عرب ملکوں

کے سفارتی نمائندوں کو جمع کیا گیا تھا۔ مشیخۃ اسلامیہ کے رئیس بذات خود کسی سفر کی وجہ سے نہ آسکے، لیکن اپنے نائب رئیس کو بھیجا۔ البانیہ میں غالباً صدیوں سے یہ نظام چلا آتا ہے کہ مشیخۃ اسلامیہ ایک پرائیویٹ تنظیم ہوتی ہے جسکے عہدہ داروں کا تقرر حکومت نہیں کرتی، بلکہ خود علماء کرتے ہیں، اور اسکی آمدنی بھی عوامی چندوں کے ذریعے ہوتی ہے۔ یہی ادارہ مختلف شہروں میں مفتیوں کا تقرر کرتا ہے۔ ان علاقوں میں مشیخہ اور اسکے مقرر کردہ مفتی حضرات وہی فرائض انجام دیتے ہیں جو عام طور پر وزارت مذہبی امور انجام دیا کرتی ہے۔ اور حکومت اس ادارے کو اسی حیثیت میں تسلیم بھی کرتی ہے۔ ملک پر جو حالات گذرے ہیں، انکی وجہ سے ان حضرات کی علمی حیثیت عموماً کمزور ہوتی ہے، لیکن جو کام وہ کرتے ہیں، انہیں غیر جانبدار علماء کی تنقید کے باوجود گئے گذرے حالات میں غنیمت ہی سمجھنا چاہیئے۔

کانفرنس کا آغاز تلاوت قرآن کریم کے بعد مشیخہ کے نائب رئیس کی تقریر سے ہوا جسکا انگریزی ترجمہ ساتھ ساتھ کیا گیا۔ انہوں نے زیادہ تر مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان پُر امن بقائے باہمی پر بات کی، اور دہشت گرد گروپ اسلام کی جو غلط نمائندگی کر رہے ہیں، انکی تردید پر زور دیا۔ انکے بعد البانیہ کے ایک سابق مفتی مصطفیٰ نے بڑی پُر اثر تقریر کرتے ہوئے بڑے پُر درد انداز میں کمیونزم دور کے واقعات سُنائے کہ کس طرح مسجدوں کو شہید کیا گیا، نماز روزے پر پابندیاں لگائی گئیں، اور جس شخص کے گھر میں کوئی دینی کتاب پائی جاتی، اسے کس درندگی کے ساتھ سزائیں دی جاتی تھیں۔ انہوں نے خود اپنے بارے میں بتایا کہ انہوں نے اپنی دینی کتابیں اپنے گھر کے صحن میں گڑھا کھود کر اس میں دفن کی تھیں۔ انکی اثر انگیز تقریر کا انگریزی ترجمہ مسلم ویلفیئر انسٹی ٹیوٹ کے ایک ذمہ دار نے کیا، اور حاضرین پر اسکا بڑا اثر ہوا۔ اسکے بعد حضرت مولانا مفتی شبیر صاحب مدظلہم کو یہ فریضہ سونپا گیا تھا کہ وہ بتائیں کہ انگلینڈ میں مسلمانوں نے اپنی نسلوں کی حفاظت کے کس طرح انتظامات کئے ہیں، چنانچہ انہوں نے اپنی مختصر تقریر میں اپنے تجربات کی روشنی میں دو پیغام دیئے۔ ایک ایمان کی حفاظت اور نئی نسلوں کے تحفظ کے لئے تعلیم و تربیت کا مناسب انتظام، اور دوسرے باہمی تعاون کے ساتھ یہاں کے مسائل کو حل کرنے کی کوشش۔ انہوں نے سابق مفتی صاحب کی تقریر کے بارے میں کہا کہ میرا دل چاہتا ہے کہ میں انکی پیشانی اور ہاتھوں کو بوسہ دوں، اور ان سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ کتابیں جو زمین میں دفن کر کے محفوظ کی گئیں، انکو ایک میوزیم میں یادگار کے طور پر رکھا جائے۔

جنوبی افریقہ سے مولانا ابراہیم منگیر اصاحب بھی کانفرنس میں مدعو تھے، اورانہوں نے بتایا کہ جنوبی افریقہ میں مسلم اقلیت کے دینی تحفظ کے لئے کس طرح اقدامات کئے گئے، اورانہیں کیا کامیابی نصیب ہوئی۔ اسکے بعد پروگرام کے مطابق حضرت مولانا مفتی احمد خانپوری صاحب مدظلہم کو خطاب کرنا تھا جو اسٹیج پر تشریف فرما تھے۔ اور میری بڑی خواہش تھی کہ میں انکا بیان سنوں، لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے حضرت مدظلہم نے مجھے حکم دیا کہ میرے حصے کا وقت بھی تم لے لو، اور کھل کر ضروری باتیں کرلو۔ رفقاء نے یہ بھی مشورہ دیا کہ میرا خطاب عربی میں ہو، تاکہ کم ازکم مشیخہ اور مفتی حضرات، نیز عرب ملکوں کے نمائندے تمہاری بات کسی مترجم کے واسطے کے بغیر سُن سکیں۔ چنانچہ میں نے عربی میں خطاب کیا، اور مسجد دینا ہوسگا (Dina Hoxha) کے امام شیخ احمد کلایا نے جو مدینہ یونی ورسٹی کے فاضل اور ملک کے مقبول ترین علماء میں سے ہیں، البانی زبان میں اسکا ترجمہ کیا۔ میں نے عرض کیا کہ یوں تو الحمدللہ بچپن ہی سے تمام مسلمانوں کی محبت دل میں پیوست ہے، لیکن جو ممالک ستر سال سے زیادہ کمیونزم کے تسلط میں رہے، انکے مسلمانوں سے سب سے زیادہ محبت ہے، کیونکہ انہوں نے ظلم وستم کے پہاڑ ٹوٹنے کے باوجود جس غیرت وحمیت کے ساتھ اپنے دین کا تحفظ کیا، اسکی وجہ سے انہیں ایمان کی جو قدر و قیمت اور اسکی جو حلاوت انہیں نصیب ہوئی، ہم اسکا اندازہ بھی نہیں کرسکتے۔ انہی کی جدوجہد سے بفضلہٖ تعالیٰ اب انہیں آزادی نصیب ہوئی، اور اسکے بعد انہوں نے جس طرح نئی مسجدیں تعمیر کیں، اور ادارے بنائے، اس پر مبارکباد دینے کیلئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔ اور حضرت مفتی شبیر صاحب کی تجویز پر میں پہلے ہی سابق مفتی صاحب کی پیشانی چومنے کا شرف حاصل کرچکا ہوں۔ میں بارہ سال پہلے یہاں آیا تھا، تو اس وقت حالات بڑے افسوسناک تھے، لیکن بارہ سال بعد یہاں کا دورہ کرتے ہوئے الحمدللہ نمایاں تبدیلیاں محسوس ہوتی ہیں۔ ان تبدیلیوں میں مسلم ویلفیر انسٹی ٹیوٹ کا بھی قابل قدر حصہ ہے۔ لیکن اب یہاں کے علماء اور اہل دین کو ایک دوسرے بڑے چیلنج کا سامنا ہے، اور وہ یہ کہ ستر سال میں الحمدللہ آپ اپنے ایمان کے تحفظ میں کامیاب ہوئے، لیکن کمیونسٹ استعمار کی تاریک رات نے اپنے بہت سے بُرے اثرات نئی نسلوں پر چھوڑ دئے ہیں۔ اب ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوانوں کی تعلیم وتربیت کی طرف بھرپور توجہ دی جائے، اور انہیں اسلامی احکام اور اسلامی ثقافت سے روشناس کرایا جائے۔ الحمدللہ مسجدیں بن رہی ہیں، اور ان میں مکاتب بھی قائم ہورہے ہیں۔ اب انہیں آباد کرنے کی ضرورت ہے، اور اس عظیم کام کے لئے جو خدمت بھی ہمارے لائق ہو، ہم اسکے لئے حاضر ہیں، اور مسلم ویلفیر

انسٹی ٹیوٹ اسکے لئے عملی طور پر سرگرم ہے، اسکے ذریعے ہم بھی کوئی خدمت انجام دینے کو اپنی سعادت سمجھیں گے۔

کانفرنس کا اختتام ظہرانے پر ہوا، اور اس میں بہت سے معززین سے مفید گفتگو کا موقع ملا۔

اس کانفرنس کے ساتھ ساتھ دوسری طرف مسلم ویلفیئر انسٹی ٹیوٹ نے البانی بیواؤں اور یتیموں کا ایک اجتماع دوسری جگہ منعقد کیا ہوا تھا، اصل میں تو یہ ان بیواؤں اور یتیموں کا اجتماع تھا جنکی سرپرستی یہ تنظیم کررہی ہے، لیکن اس میں دوسری خواتین اور بچیاں بھی شریک ہوئیں، اور انہوں نے عربی تلاوت اور البانی نظمیں پیش کیں، اور آخر میں میری اہلیہ نے ان سے خطاب کیا جس کا ترجمہ بھی پچھلے دن کی طرح البانی خاتون نے کیا۔

اس کے بعد اصل پروگرام یہ تھا کہ ہم یہاں سے دِرّوس شہر جا کر وہاں ایک مسجد میں نماز مغرب ادا کریں، اور وہاں بھی کچھ بیانات ہوجائیں۔ لیکن وہ شیخ احمد کالایا صاحب جنہوں نے میری تقریر کا عربی سے ترجمہ کیا تھا، انکا اصرار ہوا کہ آج شام میں انکی مسجد میں حاضر ہوکر وہاں کے لوگوں سے خطاب کروں۔ مولانا حنیف صاحب نے مجھے بتایا کہ یہ مسجد سلفی حضرات کی مسجد ہے، اور یہ زیادہ مفید ہوگا کہ آپ کا خطاب وہاں ہو، اور آپ جو دعوت تبلیغی مرکز میں دیکر آئے ہیں کہ یہاں سلفی اور غیر سلفی کے اختلافات کو نہ چھیڑا جائے، اس بات کو وہاں بھی پہنچانے کی ضرورت ہے، اور یہ ایک اچھی بات ہے کہ انہوں نے آپ کو خود دعوت دی ہے، اس لئے آپ کا وہاں جانا انشاء اللہ تعالیٰ زیادہ فائدہ مند ہوگا۔ جہاں تک دِرّوس کا تعلق ہے، وہاں ہم حضرت مفتی احمد خانپوری اور مفتی شبیر صاحب کو پہلے لے جائیں گے، اور ان سے مستفید ہونگے، آپ مغرب کے بعد وہاں خطاب کرکے دِرّوس پہنچ جائیں۔ چنانچہ یہ حضرات دِرّوس کے لئے روانہ ہوگئے، اور میں مغرب سے پہلے دینا ہوگسا کی مسجد میں پہنچ گیا۔ یہ مسجد ترانا شہر کے بالکل وسط میں واقع ہے۔ شیخ احمد کالایا صاحب اور انکے کچھ رفقاء پہلے سے انتظار میں کھڑے تھے۔ مغرب کی اذان میں چند منٹ باقی تھے۔ انہوں نے اس دوران مسجد اور اسکی کارکردگی کا تعارف کرایا۔ مسجد کے دروازے پر ایک چھوٹا سا اسٹال لگا ہوا تھا جس پر البانی زبان میں چھوٹے چھوٹے کتابچے رکھے تھے جو دلچسپ انداز میں اسلام اور اسکے مبادی اور انبیاء اور صحابہ کے واقعات پر مشتمل تھے۔ امام صاحب نے بتایا کہ مسجد کے سامنے ایک چلتا ہوا بارونق اور ماڈرن بازار ہے۔ بعض لوگ چلتے چلتے اچانک مسجد دیکھنے کے لئے رُک جاتے ہیں۔ یہ کتابچے انہیں دیدیئے جاتے ہیں، اور انکی وجہ سے نوجوانوں کو مسجد میں آنے کا داعیہ پیدا ہوتا ہے۔ چونکہ مسجد میں الحمدللہ دین کی ہلکی پھلکی باتیں بھی سکھائی جاتی ہیں، اس لئے بفضلہٖ تعالیٰ نوجوانوں میں مسجد آنے کا

رجحان بڑھتا جارہا ہے۔

امام صاحب نے اصرار کیا کہ مغرب کی نماز میں پڑھاؤں، چنانچہ ایسا ہی ہوا۔مغرب کے بعد انہوں نے البانی زبان میں میرا مختصر تعارف کرایا، پھر مجھے عربی میں خطاب کرنے کی دعوت دی۔اگرچہ یہ خطاب بہت مختصر نوٹس پر ہوا تھا، لیکن مجمع یہاں کے لحاظ سے کافی بڑا تھا، اور بڑی توجہ سے سُننے کے لئے بیٹھا تھا۔امام صاحب کا کہنا تھا کہ انہیں اور انکے رفقاء کو حدیث کی اجازت بھی دوں، اس لئے میں نے اپنے خطاب کا آغاز حدیث مسلسل بالاولیۃ سے کیا۔یعنی حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی یہ حدیث:

الراحمون یرحمھم الرحمن تبارک وتعالی .ارحموا من فی الأرض یرحمکم من فی السماء

یعنی : رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم کرتا ہے۔تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا۔

پھر میں نے اسی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے عرض کیا کہ محدثین نے اپنے شاگردوں کو حدیث کی تعلیم دینے کے لئے سب سے پہلے اس حدیث کو منتخب فرمایا جس کا تقاضا یہ ہے کہ اسلام کے طالب علم کو سب سے پہلے رحم کرنے کا درس دینا مقصود ہے، جو اسلام کی ایک بنیادی تعلیم ہے۔پھر رحم کرنے کے لئے صرف مسلمانوں کا لفظ استعمال نہیں فرمایا گیا، بلکہ تمام "زمین والوں " کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام انسانوں پر رحم کھانے کی تاکید فرمائی گئی ہے۔البتہ رحم کے عنوانات مختلف ہوتے ہیں۔غیر مسلموں پر سب سے بڑا رحم یہ ہے کہ انہیں دوزخ کی آگ سے بچایا جائے، اور اگر کوئی پُر امن غیر مسلم کسی مصیبت یا تکلیف میں ہو، تو اسکا ازالہ کیا جائے۔غیر مسلموں کی ذات سے نفرت نہیں، بلکہ انکے کفر سے نفرت ہونی چاہئے جیسے ایک بیمار سے نہیں، اسکی بیماری سے نفرت کی جاتی ہے، اور اسکا علاج کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔دعوت وتبلیغ اسی قسم کے رحم کھانے کا ایک طریقہ ہے جسے پیغمبرانہ اسلوب میں انجام دینا چاہئے۔اسی بات کو مختلف مثالوں سے واضح کرنے کے بعد میں نے عرض کیا کہ آج ہمارا حال یہ ہوگیا ہے کہ غیر مسلم تو درکنار، ہم اپنے سے کوئی فروعی اختلاف رکھنے والوں کو بھی اجنبی سمجھتے اور اُسے بُرا بھلا کہنے میں مصروف رہتے ہیں، جو شخص حنفی ہے، وہ سلفیوں سے اور جو سلفی ہے، وہ حنفیوں سے نہ صرف مغایرت برتتا ہے، بلکہ بعض اوقات اُسے مطلقاً گمراہ بلکہ کافر اور مشرک قرار دینے سے بھی نہیں چوکتا۔میں نے عرض کیا کہ آپ ایک ایسے ملک میں رہتے ہیں جہاں مسلمانوں پر کمیونزم کی انتہائی پُر تشدد اندھیری

رات گذری ہے۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا کرم ہے کہ یہ رات گذر گئی، اور مسلمانوں نے کم از کم نام اور عقیدے کی حد تک اپنا ایمان محفوظ رکھا۔ لیکن اس تاریک رات میں جو نسلیں پروان چڑھی ہیں، وہ دین کے مبادی تک سے بے خبر ہیں۔ الحمدللہ آپ حضرات کی کوششوں سے اب صورت حال میں خاصی تبدیلی آرہی ہے، لیکن اگر ایسے موقع پر حنفی ،سلفی کے جھگڑے کھڑے کئے گئے، تو خطرہ ہے کہ نوجوان اصل دین ہی سے برگشتہ نہ ہوجائیں۔ ہمارے درمیان بیشک فروعی اختلافات موجود ہیں، لیکن ان باتوں کی تعداد کہیں زیادہ ہے جن پر ہم متفق ہیں۔ اپنے اپنے دائروں میں بیشک اپنے طریقوں پر عمل کریں، لیکن کسی دوسرے کے طریقے پر طعن وتشنیع سے باز رہیں۔

اجتہادی امور میں کوئی جانب منکر نہیں ہوتی، اس لئے ان پر نکیر بھی جائز نہیں۔ نیز نوجوان جس کسی کی کوشش سے اسلامی زندگی کی طرف آجائے، اُسے غنیمت سمجھیں، اور اپنی کوششوں کو دین کے مبادی پر مرکوز رکھیں۔ امام صاحب ساتھ ساتھ میرے بیان کا البانی ترجمہ کررہے تھے، اور پورا مجمع ہمہ تن گوش تھا، یہاں تک کہ عشاء کا وقت ہوگیا۔

اس موضوع کی میری نظر میں اہمیت اس لئے تھی کہ بلقانی ریاستوں میں مسلمان حنفی ہیں، لیکن جو لوگ سعودی یونی ورسٹیوں میں پڑھکر لوٹے ہیں، بفضلہٖ تعالیٰ وہ کام تو اچھا کررہے ہیں، لیکن بعض جوشیلے نوجوان سلفیت کے جوش میں غیر ضروری مسائل چھیڑ کر بحث ومباحثہ کی فضا پیدا کردیتے ہیں۔ انکے مقابلے میں حنفی علماء ان کی تردید کرتے ہیں، اس طرح یہاں کے عام مسلمان جو دین کے مبادی سے ناآشنا ہیں، وہ دین کے بارے میں سخت کشمکش کا شکار ہوجاتے ہیں۔ خدا کرے کہ میری یہ کمزور مگر دردمندانہ آواز کوئی اثر پیدا کرسکے۔ امام صاحب بذات خود سعودی عرب سے تعلیم حاصل کرکے آئے تھے، لیکن انہوں نے میری عاجزانہ گذارشات کی تائید کی، اور بتایا کہ الحمدللہ ہم اسی نہج پر کام کی کوشش کررہے ہیں، آپ کی باتیں بالکل درست ہیں، اور ہم سب کو اسی طرح مل کر کام کرنا چاہئے۔

تمام حاضرین بہت محبت سے ملے، اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے بیان کا بہت اچھا اثر نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ یہ بیان انٹرنیٹ پر براہ راست نشر ہورہا تھا، اس لئے الحمدللہ بڑے پیمانے پر سنا گیا، اور لوگوں نے بتایا کہ اس پر مثبت تبصرے ریکارڈ کئے گئے۔

نماز مغرب یہاں ساڑھے آٹھ بجے اور عشاء ساڑھے دس بجے ہورہی تھی۔ اس لئے ہم مسجد سے گیارہ بجے

کے بعد نکلے۔ یہاں سے ہمیں درّوس جانا تھا جہاں ہمارے بہت سے رفقاء پہلے ہی پہنچ چکے تھے۔ رات ہمیں وہیں گذارنی تھی۔ درّوس بحیرۂ ایڈریاٹک کے کنارے ایک شہر ہے جسکے بارے میں بتایا یہ گیا تھا کہ ترانا شہر سے ۴۵ منٹ کے فاصلے پر واقع ہے، لیکن چند در چند غلط فہمیوں کی بنا پر ہمارا راستہ بہت طویل ہوگیا، اور ہم جب درّوس کے ہوٹل پہنچے تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ ہمارے ساتھیوں نے کچھ کھانا ہمارے لئے بچا کر رکھا ہوا تھا۔ غرض بستر پر جاتے جاتے دو بج گئے۔

میرے لحاظ سے درّوس آنے کا مقصد صرف یہاں رات گذارنا تھا، کیونکہ یہاں حضرت مولانا مفتی احمد خان پوری صاحب مدظلہم خطاب کر چکے تھے، اور مجھے مغرب کے بعد ترانا ہی کی مسجد میں بیان کرنا تھا۔ اگلی صبح ہمیں دراصل بوسنیا جانا تھا، لیکن یہاں سے بوسنیا کے قریب ترین شہر کا فاصلہ کم سے کم بارہ گھنٹے کا تھا، اور مولانا حنیف صاحب کو معلوم تھا کہ سڑک کے راستے میرے لئے اتنا لمبا سفر نا قابل تحمل ہے۔ اس لئے انہوں نے درمیان میں مونٹی نیگرو کے ایک شہر اُلسن میں ہمارے رفقاء کے لئے بکنگ کرائی ہوئی تھی، تاکہ ایک رات بیچ میں آرام کی مل جائے۔ البتہ حضرت مولانا مفتی احمد خان پوری صاحب مدظلہم کو کل صبح ہی بوسنیا سے انڈیا روانہ ہونا تھا، اس لئے انہوں نے مولانا حنیف صاحب اور ان کے رفقاء کے ساتھ بارہ گھنٹے مسلسل سفر کی مشقت گوارا فرمالی، اور وہ ہم سے پہلے بوسنیا کے لئے روانہ ہوگئے۔ اور ہم رات دیر تک جاگنے کی وجہ سے تقریباً ساڑھے گیارہ بجے صبح روانگی کے لئے تیار ہوئے۔ دِرُّس شہر میں نے اپنے پہلے دورۂ البانیا میں دیکھا تھا۔ یہ بحیرۂ ایڈریاٹک کے ساحل پر واقع ہے، اور صبح کے وقت ہوٹل سے اس کا منظر بڑا دلفریب تھا۔ یہاں سے ہم روانہ ہوئے تو تقریباً دو ڈھائی گھنٹے البانیہ ہی میں چلتے رہے البانیہ کا آخری شہر شکودرہ تھا جس میں میں پہلے بھی جاچکا ہوں۔ یہ بڑے بڑے علماء کا شہر رہا ہے، اور شیخ ناصر الدین البانی رحمۃ اللہ علیہ اسی شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ اس شہر کے باہر باہر گذرتے ہوئے ہم دو بجے مونٹی نیگرو کی سرحد پر پہنچ گئے۔

مونٹی نیگرو کے معنیٰ ہیں "سیاہ پہاڑ" اسی لئے اسکا عربی نام "الجبل الاسود" ہے، اور اس کے پہاڑوں کو دیکھ کر یہ نام بالکل درست معلوم ہوتا ہے، اس لئے کہ یہاں کے پہاڑ اگرچہ نہایت سرسبز اور بہت خوش منظر ہیں، لیکن ان کی تہہ میں پہاڑوں کی سیاہی محسوس کی جاسکتی ہے۔ مونٹی نیگرو 13810 کیلومیٹر کے رقبے میں پھیلا ہوا ہے۔ یہاں سے تقریباً تین گھنٹے کا سفر اس طرح طے ہوا کہ ہمارے دائیں طرف اونچے اونچے سرسبز و

شاداب پہاڑ تھے، جو قدرتی طور پر انجیر، زیتون اور خوبانی کے درختوں سے مالا مال نظر آرہے تھے۔ اور بائیں طرف بحر ایڈریاٹک اور اسکے حسین جزیرے تھے۔ ایڈریاٹک کے دوسری طرف اٹلی کا علاقہ تھا۔ موسم بھی بہت خوشگوار ٹھنڈا تھا، اور پورے سفر میں اللہ تعالیٰ کی قدرت وحکمت اور صناعی کے کرشموں سے آنکھیں ٹھنڈی ہورہی تھیں۔ بھائی جان مرحوم کا شعر یاد آیا:

اس آئینہ خانے میں سبھی عکس ہیں تیرے
اس آئینہ خانے میں تُو یکتا ہی رہے گا

مونٹی نیگرو کا دارالحکومت پوڈگوریکا (Podgorica) ہے، لیکن بوسنیا جاتے ہوئے وہ راستے میں نہیں پڑتا۔ اس لئے ہم اسکے ایک اور شہر اُلسنج (Ulcinj) جانا تھا جو بوسنیا سے نسبۃً قریب تھا۔ وہاں ایک ہوٹل میں عصر کے بعد قیام کیا۔ نزدیک ہی ایک مسلمانوں کا ریسٹورنٹ تھا، اور معلوم ہوا کہ یہاں مسلمان اچھی خاصی تعداد میں آباد ہیں، اور یہاں بھی حلال کھانا آسانی سے میسر آجاتا ہے۔ رات ہم نے یہاں گذاری، اور اگلی صبح ہم دس بجے کے بعد یہاں سے بوسنیا کے لئے روانہ ہوگئے۔ یہ پورا راستہ بحر ایڈریاٹک کے کنارے کنارے اتنا حسین راستہ تھا کہ نگاہیں اس سے ہٹتی نہیں تھیں۔ سمندر، پہاڑ اور اس پر آسمان کو چھوتے ہوئے قدرتی درخت بوسنیا کی سرحد تک دعوت نظارہ دیتے رہے۔ پونے دو بجے کے قریب ہم بوسنیا کی سرحد پر پہنچے۔ یہاں ایڈریاٹک ہم سے جدا ہوگیا، اور سرسبز میدانی اور پہاڑی علاقے شروع ہوگئے جنکے بیچ میں بہتی ہوئی ندیاں اور جھیلیں بار بار نظروں کو تازگی بخشتی تھیں۔

جاری ہے.....

☆☆☆

پیشکش؛ابومعاذ راشد حسین